ALLAMA IQBAL OPEN UNIVERSITY

USMAN NOTES
www.usmannotes.com

Name:

Registration No.:

Course Code: 1911

Program: BS Islamic Studies

Semester: Autumn 2026

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

کورس :دعوت و ارشاد • (1911) سطح :بی ایس علومِ اسلامیہ

سمسٹر :خزاں2026

امتحانی مشق نمبر) 1 یونٹ 1 تا(5

کل نمبر • 100 :کامیابی کے نمبر50 :

حل شدہ اسائنمنٹ گائیڈ

)مطالعہ و حوالہ کے لیے(

نوٹ :یہ گائیڈ صرف مطالعہ اور حوالے کے مقصد کے لیے تیار کی گئی ہے۔ طلبہ کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ کورس کی کتاب کے متعلقہ یونٹس غور سے پڑھیں، تصورات کو اچھی طرح سمجھیں اور پھر اسا نمنٹ اپنے الفاظ میں لکھیں۔

سوال نمبر :1 دعوت کا مفہوم :علامہ زمخشری اور راغب اصفہانی کی آراء میں وسعت اور اس کی وجوہات 20) نمبر(

سوال نمبر1 ۔ علامہ زمخشری اور راغب اصفہانی کے نزدیک دعوت کے مفہوم میں کیا وسعت اور وجوہات بیان ہوئی ہیں؟(20)

تعارف

دعوت اسلام کا بنیادی فریضہ اور امتِ مسلمہ کی پہچان ہے۔ قرآنِ کریم نے اس امت کو خیرِ امت قرار دیتے ہوئے اس کی وجہ یہ بیان فرمائی کہ وہ نیکی کا حکم دیتی ہے، برائی سے روکتی ہے اور اللہ پر ایمان رکھتی ہے۔ لیکن دعوت کا مفہوم محض کسی کو زبانی طور پر کوئی بات کہہ دینے کا نام نہیں ہے۔ بڑے ائمہِ لغت و تفسیر نے اس لفظ کی گہرائی بیان کرتے ہوئے اسے ایک وسیع اور ہمہ گیر عمل قرار دیا ہے۔ ان میں علامہ راغب اصفہانی) متوفی502 ھ (کی کتاب المفردات فی غریب القرآن اور علامہ زمخشری) متوفی538 ھ (کی تفسیر الکشاف اور اساس البلاغہ کو خصوصی مقام حاصل ہے۔

اس جواب میں پہلے دعوت کا لغوی مفہوم، پھر ان دونوں بزرگوں کی آراء کی روشنی میں اس کی وسعت، اور آخر میں اس وسعت کی وجوہات کا جائزہ پیش کیا جاتا ہے، تاکہ یہ واضح ہو سکے کہ دعوت ایک وقتی نعرہ نہیں بلکہ انسان کی پوری زندگی کو اللہ کی بندگی کی طرف متوجہ کرنے کی جامع جدوجہد ہے۔

یہ نکتہ بھی پیشِ نظر رہے کہ دعوت کا لفظ قرآنِ کریم میں متعدد مواقع پر مختلف صیغوں کے ساتھ آیا ہے: کبھی اللہ تعالیٰ خود بندوں کو امن و سلامتی کی طرف بلاتا ہے، کبھی رسول اللہ ﷺ کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ حکمت کے ساتھ اپنے رب کے راستے کی طرف بلائیں، اور کبھی ایمان والوں کو خیر کی طرف دعوت دینے والا گروہ بننے کی تلقین کی جاتی ہے۔ اس قرآنی استعمال کی وسعت ہی دراصل وہ بنیاد ہے جس پر اہلِ لغت نے دعوت کے مفہوم کو وسیع کیا۔ لہٰذا جب ہم زمخشری اور راغب اصفہانی کی آراء پڑھتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ وہ لفظ کی لغوی تہہ سے آگے بڑھ کر اس کی عملی اور تمدنی جہتوں کو بھی سامنے لاتے ہیں۔ یہی وسعت آج کے داعی کے لیے رہنما ہے، کیونکہ اس سے دعوت کا دائرہ خطبے اور تقریر سے نکل کر کردار، خدمت، تعلیم اور سماجی اصلاح تک پھیل جاتا ہے۔

دعوت کا لغوی و اصطلاحی مفہوم

عربی زبان میں دعوت کا مادہ دعو ہے، جس کے معنی ہیں: بلانا، پکارنا، کسی کی طرف متوجہ کرنا اور کسی چیز کی طرف مائل کرنا۔ دعا، دعوت، داعی اور مدعو سب اسی مادے سے بنے ہیں۔ لغت کی رو سے جب کوئی شخص کسی دوسرے کو کسی کام، مجلس یا راستے کی طرف توجہ اور رغبت کے ساتھ بلاتا ہے تو اسے دعوت کہا جاتا ہے۔ اصطلاحی طور پر دعوت سے مراد اللہ تعالیٰ کی بندگی، اس کے دین کی اطاعت اور اس کے رسول ﷺ کی پیروی کی طرف انسانوں کو بلانا ہے۔ اس تعریف میں تین عناصر نمایاں ہیں: ایک بلانے والا یعنی داعی، دوسرا جسے بلایا جائے یعنی مدعو، اور تیسرا وہ پیغام جس کی طرف بلایا جائے یعنی اسلام کی تعلیمات۔ اگر ان میں سے کوئی عنصر کمزور ہو جائے تو دعوت کا عمل بھی نامکمل رہ جاتا ہے۔

اہلِ لغت نے یہ بھی واضح کیا ہے کہ دعوت میں صرف اطلاع دینا مقصود نہیں ہوتا، بلکہ مخاطب کے دل میں قبولیت کی تحریک پیدا کرنا بھی اس کا حصہ ہے۔ اسی لیے قرآن نے دعوت کے ساتھ حکمت، نرمی اور بہترین اندازِ گفتگو کی شرائط جوڑ دیں۔ ایک سادہ اعلان اور ایک پراثر دعوت میں یہی فرق ہے کہ اعلان کانوں تک پہنچتا ہے جبکہ دعوت دل

تک اترنے کی کوشش کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ داعی کے لیے علم کے ساتھ اخلاص، صبر اور حسنِ اخلاق کو لازمی قرار دیا گیا۔ جب دعوت کے مفہوم کو اس زاویے سے دیکھا جائے تو اس کی وسعت خود بخود ظاہر ہو جاتی ہے کہ یہ زبان کے ساتھ دل، عمل اور ماحول سب کو شامل کرتی ہے۔

راغب اصفہانی کے نزدیک دعوت کی وسعت

راغب اصفہانی نے المفردات میں دعوت کے استعمالات کو قرآن کی روشنی میں جمع کیا ہے۔ ان کے نزدیک دعوت کا اطلاق اللہ کی طرف بلانے کے علاوہ خیر کی طرف بلانے، مدد کے لیے پکارنے، مہمان کو کھانے پر بلانے اور کسی نظریے کی طرف رغبت دلانے پر بھی ہوتا ہے۔ اس تنوع سے معلوم ہوتا ہے کہ دعوت کا دائرہ صرف مذہبی خطاب تک محدود نہیں، بلکہ ہر وہ پکار جو کسی مقصد کی طرف توجہ مبذول کرائے، اس لفظ کے دائرے میں آ سکتی ہے۔ تاہم شرعی اصطلاح میں اس کا اعلیٰ ترین مصداق اللہ کی توحید، رسالت کی پیروی اور اخروی کامیابی کی طرف بلانا ہے۔ راغب کی توضیح کا حاصل یہ ہے کہ دعوت میں نداء بھی ہے، ترغیب بھی ہے اور رہنمائی بھی؛ یعنی داعی صرف پکارنے والا نہیں، راستہ دکھانے والا بھی ہے۔

راغب اصفہانی کی ایک اور اہم توضیح یہ ہے کہ قرآن میں اللہ تعالیٰ کی دعوت کو زندگی کی طرف دعوت قرار دیا گیا ہے، جیسا کہ سورۃ الانفال میں فرمایا گیا کہ اللہ اور اس کے رسول کی پکار کو قبول کرو جب وہ تمہیں اس چیز کی طرف بلائیں جو تمہیں زندگی بخشنے والی ہے۔ اس سے دعوت کی وسعت کا ایک نیا پہلو کھلتا ہے کہ دعوت محض چند رسوم کی تلقین نہیں بلکہ مردہ دلوں کو زندہ کرنے، گمراہ ذہنوں کو روشنی دینے اور بکھرے ہوئے معاشرے کو مقصد عطا کرنے کا نام ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ دارالسلام یعنی سلامتی کے گھر کی طرف بلاتا ہے، جس سے پتا چلتا ہے کہ دعوت کا مقصد انسان کو خوف، جہالت، ظلم اور اضطراب سے نکال کر امن و ایمان کی فضا میں لانا ہے۔ یوں راغب کے نزدیک دعوت کا مفہوم عقیدے سے لے کر انسانی سلامتی اور روحانی زندگی تک وسیع ہے۔

علامہ زمخشری کے نزدیک دعوت کی وسعت

علامہ زمخشری نے الکشاف میں دعوت سے متعلق آیات کی تفسیر کرتے ہوئے اس کے بلاغتی اور معنوی پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔ سورۃ النحل کی آیت ادع الی سبیل ربک کی تفسیر میں وہ اس نکتے کو نمایاں کرتے ہیں کہ دعوت کا محل اللہ کا

راستہ ہے، داعی کی اپنی ذات یا گروہ نہیں۔ اس سے دعوت کی وسعت میں ایک اصولی اضافہ ہوتا ہے کہ داعی اپنے آپ کو مرکز نہیں بناتا بلکہ مخاطب کو اللہ سے جوڑتا ہے۔ زمخشری کے اندازِ تفسیر سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ دعوت میں حکمت کا تقاضا ہے کہ ہر شخص سے اس کی ذہنی سطح، مزاج اور حالات کے مطابق بات کی جائے۔ عالم کے لیے دلیل، عام آدمی کے لیے پند و نصیحت، اور ضدی مخالف کے لیے بہترین طریقے پر مناظرہ ہو؛ یہ تدریجی اور نفسیاتی وسعت زمخشری کی بلاغی نظر کا نتیجہ ہے۔

زمخشری کے نزدیک دعوت کی وسعت کی ایک جہت یہ بھی ہے کہ یہ صرف کافروں کو اسلام کی طرف بلانے تک محدود نہیں رہتی، بلکہ مسلمانوں کو بھی مسلسل نیکی، تقویٰ اور اصلاح کی طرف بلانا اسی میں شامل ہے۔ قرآن نے ایمان والوں سے بھی بارہا کہا کہ وہ اللہ اور رسول کی پکار پر لبیک کہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ دعوت ایک دائمی عمل ہے جو قبولِ اسلام کے بعد ختم نہیں ہو جاتا بلکہ ایمان کی تجدید، عمل کی اصلاح اور گناہوں سے توبہ کی صورت میں جاری رہتا ہے۔ زمخشری کی بلاغی توضیحات سے یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ دعوت کا اسلوب سخت اور خشک نہیں ہونا چاہیے، کیونکہ بلانا اسی کو کہا جاتا ہے جس میں مخاطب کے لیے کشش اور خیرخواہی ہو۔ یوں ان کے ہاں دعوت عقیدہ، اخلاق، علم اور اسلوب، چاروں لحاظ سے وسیع مفہوم رکھتی ہے۔

دعوت کے مفہوم میں وسعت کی وجوہات

اس وسعت کی پہلی وجہ خود قرآنِ کریم کا متنوع استعمال ہے۔ قرآن میں دعوت کا لفظ اللہ کی طرف، رسول کی طرف، خیر کی طرف، سلامتی کی طرف اور حتیٰ کہ بعض مقامات پر شر کی طرف بلانے کے لیے بھی استعمال ہوا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس لفظ کی لغوی گنجائش بہت زیادہ ہے۔ دوسری وجہ انسان کی فطرت اور اس کی ہمہ جہتی ضروریات ہیں :انسان صرف عقل نہیں رکھتا، اس کا دل، جذبات، عادات اور سماجی تعلقات بھی ہیں؛ لہٰذا جو دعوت اسے اللہ کی طرف لانا چاہتی ہے اسے اس کی پوری شخصیت سے خطاب کرنا ہوگا۔ تیسری وجہ اسلام کی جامعیت ہے :اسلام عبادت بھی ہے، اخلاق بھی، معاشرت بھی اور نظامِ زندگی بھی، تو اس کی دعوت بھی لامحالہ اتنی ہی جامع ہوگی۔

چوتھی وجہ مخاطبین کا تنوع ہے۔ داعی کے سامنے بچے اور بوڑھے، عالم اور جاہل، نرم دل اور سخت مخالف، سب قسم کے لوگ ہوتے ہیں، اس لیے دعوت کی شکلیں بھی متنوع ہوتی ہیں :کبھی درس، کبھی انفرادی ملاقات، کبھی تحریر، کبھی

خدمتِ خلق اور کبھی اپنے عمل کی خاموش گواہی۔ پانچویں وجہ یہ ہے کہ دعوت کا مقصد صرف معلومات کی منتقلی نہیں بلکہ دلوں کی تبدیلی اور کردار کی تعمیر ہے، اور تبدیلی ہمیشہ لمبے، صبر آزما اور کثیر جہتی عمل سے آتی ہے۔ انہی وجوہات کی بنا پر علمائے لغت و تفسیر نے دعوت کے مفہوم کو تنگ دائرے میں بند نہیں کیا۔ آج کے دور میں ذرائع ابلاغ اور سماجی رابطے کے نئے وسیلوں نے اس وسعت کو مزید بڑھا دیا ہے، مگر اس کے اصول وہی قرآنی ہیں جو زمخشری اور راغب نے بیان کیے۔

خلاصہ

خلاصہ یہ ہے کہ راغب اصفہانی اور علامہ زمخشری دونوں کے نزدیک دعوت کا مفہوم محض کسی کو بات سنا دینے سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔ راغب نے اسے زندگی، سلامتی اور خیر کی طرف ایک جامع پکار قرار دیا، جبکہ زمخشری نے اس کے بلاغتی، نفسیاتی اور اسلوبی پہلوؤں کو نمایاں کر کے بتایا کہ دعوت کا مرکز اللہ کا راستہ ہے اور اس کا دائرہ کافر و مسلم، عالم و عامی سب کو محیط ہے۔ اس وسعت کی بنیادی وجوہات قرآن کا متنوع استعمال، انسان کی ہمہ جہت فطرت، اسلام کی جامعیت اور مخاطبین کا تنوع ہیں۔ طالب علم کے لیے اس بحث کا عملی سبق یہ ہے کہ داعی بننے کے لیے صرف معلومات کافی نہیں، بلکہ پیغام کی جامع سمجھ، مخاطب کی نفسیات کا لحاظ اور پرخلوص خیرخواہی کا رویہ بھی ضروری ہے، تب ہی دعوت دلوں میں اترتی ہے۔

سوال نمبر :2 تعلق باللہ کی مضبوطی اور داعی کے کردار کے عملی نتائج 20) نمبر(

سوال نمبر2 ۔ تعلق باللہ کے مضبوط ہونے سے داعی کے کردار میں کون سے عملی نتائج سامنے آتے ہیں؟(20)

تعارف

دعوت کی کامیابی کا اصل راز داعی کے کردار میں پوشیدہ ہوتا ہے، اور کردار کی پائیداری کا سرچشمہ اس کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق ہے۔ جس شخص کا دل اللہ سے جڑا ہوا ہو، اس کی زبان میں صداقت، عمل میں استقامت اور رویے میں اخلاص خود بخود پیدا ہو جاتا ہے۔ قرآنِ کریم نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ جو شخص اللہ کی طرف بلاتا ہے اور نیک عمل کرتا ہے وہ بہترین قول والا ہے، یعنی قول اور عمل کی ہم آہنگی تعلق باللہ ہی سے پیدا ہوتی

ہے۔ اس کے برعکس جس داعی کا تعلق اللہ سے کمزور ہو، اس کی دعوت میں دکھاوا، تھکن، مایوسی اور دنیوی مفاد آسانی سے داخل ہو جاتے ہیں۔ اس جواب میں تعلق باللہ کے مفہوم کے بعد ان عملی نتائج کا تفصیلی جائزہ لیا جائے گا جو ایک مضبوط روحانی ربط کے نتیجے میں داعی کی شخصیت اور اس کے دعوتی عمل میں ظاہر ہوتے ہیں۔

تعلق باللہ سے مراد صرف عبادات کی ظاہری انجام دہی نہیں ہے بلکہ دل کا اللہ پر کامل یقین، اس کی محبت، اس کا خوف، اس پر توکل اور ہر حال میں اس کی رضا کو مقصد بنانا ہے۔ یہ تعلق نماز، تلاوت، ذکر، دعا اور مراقبے سے پروان چڑھتا ہے اور پھر زندگی کے ہر میدان میں اپنا رنگ دکھاتا ہے۔ داعی کے لیے یہ تعلق اس لیے بھی ناگزیر ہے کہ دعوت کا میدان آسان نہیں ہوتا :اسے مخالفت، طنز، بے رخی اور ناکامی کے مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ اگر اس کے دل میں اللہ کی معیت کا شعور نہ ہو تو وہ جلد ہمت ہار بیٹھتا ہے۔ اب ہم ان نتائج کو ایک ایک کر کے بیان کرتے ہیں تاکہ یہ معلوم ہو کہ روحانی مضبوطی کردار میں کس طرح ڈھلتی ہے۔

اخلاص، صداقت اور بے لوثی

تعلق باللہ کا سب سے پہلا عملی نتیجہ اخلاص ہے۔ مخلص داعی لوگوں کی تعریف کے لیے نہیں بولتا اور نہ ان کی ناراضی سے گھبرا کر حق بات چھوڑتا ہے، کیونکہ اس کی نظر اجر دینے والے پر ہوتی ہے، سننے والوں کی واہ واہ پر نہیں۔ یہی اخلاص اس کے کردار میں صداقت پیدا کرتا ہے :وہ جو کہتا ہے خود اس پر عمل کرتا ہے، اور جو نہیں کر سکتا اس کا دعویٰ بھی نہیں کرتا۔ قرآن نے اسی تضاد پر سخت تنبیہ فرمائی کہ تم لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو اور اپنے آپ کو بھول جاتے ہو۔ مضبوط تعلق باللہ رکھنے والا داعی اس وعید سے کانپتا ہے، اس لیے اس کی زندگی اس کے پیغام کی شرح بن جاتی ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ دلوں کو سب سے زیادہ اسی داعی نے بدلا ہے جس کے قول و فعل میں فاصلہ نہیں تھا۔

اخلاص کا دوسرا ثمر بے لوثی ہے۔ ایسا داعی دعوت کو دکان نہیں بناتا؛ وہ نہ مال کا لالچ کرتا ہے، نہ عہدے کی خواہش، نہ شہرت کی طلب۔ انبیاء علیہم السلام کی دعوت کا اعلان قرآن نے بارہا انہی الفاظ میں نقل کیا کہ میں تم سے اس پر کوئی اجر نہیں مانگتا، میرا اجر اللہ کے ذمے ہے۔ جب مدعو دیکھتا ہے کہ بلانے والا اس سے کچھ چاہتا ہی نہیں، صرف اس کی خیر چاہتا ہے، تو اس کے دل کے دروازے کھلنے لگتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں مفاد پرست داعی کی بات، چاہے کتنی

ہی مدلل ہو، دلوں میں اترتی نہیں کیونکہ لوگ اس کے پیچھے چھپا ہوا لالچ محسوس کر لیتے ہیں۔ یوں اخلاص اور بے لوثی داعی کے کردار کو وہ وقار عطا کرتے ہیں جو کسی خطیب کی فصاحت سے حاصل نہیں ہو سکتا۔

استقامت، صبر اور توکل

دعوت کی راہ میں آزمائشیں لازم ہیں، اس لیے تعلق باللہ کا دوسرا بڑا نتیجہ استقامت اور صبر کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ اللہ سے جڑا ہوا داعی نتائج کی جلدی نہیں کرتا؛ وہ جانتا ہے کہ ہدایت دینا اللہ کا کام ہے اور اس کا کام صرف پہنچانا اور ثابت قدم رہنا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام نے ساڑھے نو سو سال دعوت دی، حضرت ایوب علیہ السلام نے طویل آزمائش میں صبر کیا، اور نبی کریم ﷺ نے طائف کے پتھر کھا کر بھی بددعا کے بجائے ہدایت کی دعا فرمائی۔ یہ مثالیں اسی یقین کی پیداوار ہیں کہ اللہ دیکھ رہا ہے اور ہر قربانی اس کے ہاں محفوظ ہے۔ ایسا داعی وقتی ناکامی کو حتمی ناکامی نہیں سمجھتا، بلکہ ہر رکاوٹ کو اپنے ایمان کی آزمائش اور اجر کا موقع جانتا ہے۔

اسی سے جڑا ہوا نتیجہ توکل ہے۔ توکل کا مطلب اسباب چھوڑ دینا نہیں بلکہ اسباب اختیار کر کے نتیجہ اللہ کے سپرد کر دینا ہے۔ متوکل داعی بہترین تیاری کرتا ہے، مناسب وقت اور حکمت کا لحاظ رکھتا ہے، لیکن دل کا سہارا لوگوں کی تعداد، وسائل کی فراوانی یا حکمرانوں کی حمایت کو نہیں بناتا۔ اس توکل سے اس کے کردار میں ایک عجیب سکون اور بے خوفی پیدا ہو جاتی ہے :وہ حق بات نرم مگر واضح لہجے میں کہتا ہے، دھمکیوں سے مرعوب نہیں ہوتا اور مصلحت کے نام پر حق کو چھپاتا بھی نہیں۔ یہی وہ کیفیت ہے جس نے کمزور اور بے سروسامان داعیوں کو بڑے بڑے جابروں کے سامنے سربلند رکھا۔ پس استقامت، صبر اور توکل دراصل ایک ہی حقیقت کے تین رخ ہیں، اور تینوں کی جڑ اللہ کے ساتھ مضبوط تعلق میں ہے۔

حسنِ اخلاق، نرمی اور لوگوں سے محبت

تعلق باللہ کا تیسرا نمایاں نتیجہ حسنِ اخلاق ہے۔ جو شخص اللہ کی نگرانی کا شعور رکھتا ہے وہ کسی کمزور، جاہل یا مخالف کے ساتھ بھی بدتمیزی نہیں کر سکتا، کیونکہ وہ ہر ملاقات کو اللہ کی رضا کا موقع سمجھتا ہے۔ نبی کریم ﷺ کے بارے میں قرآن نے فرمایا کہ اللہ کی رحمت سے آپ لوگوں کے لیے نرم دل ہوئے، اگر آپ سخت دل ہوتے تو لوگ آپ کے گرد سے بکھر جاتے۔ داعی کے کردار میں نرمی، مسکراہٹ، سلام میں پہل، بیمار کی عیادت اور ضرورت مند کی مدد وہ

عملی صورتیں ہیں جن سے تعلق باللہ ظاہر ہوتا ہے۔ اصل میں عبادت کا اصل پھل اخلاق ہے؛ جس کی نماز اور روزہ اسے لوگوں کے لیے آسان اور نرم نہ بنائے، اس کے تعلق میں ابھی کمزوری باقی ہے۔

اس اخلاق کے ساتھ داعی کے دل میں لوگوں کے لیے سچی محبت اور درد بھی پیدا ہوتا ہے۔ وہ مخالف کو دشمن سمجھ کر نہیں بلکہ مریض سمجھ کر دیکھتا ہے جس کی شفا اس کا مقصد ہے۔ یہی درد حضرت محمد ﷺ کی دعوت کا عنوان تھا کہ آپ لوگوں کے ایمان نہ لانے پر اس قدر غمگین ہوتے کہ قرآن نے آپ کو تسلی دی۔ ایسا داعی کسی کی گمراہی پر خوش نہیں ہوتا، کسی کی رسوائی کا سامان نہیں کرتا اور پردہ پوشی کو اصول بناتا ہے۔ اس کے نتیجے میں سماج میں اس کی بات کا وزن بڑھتا ہے، کیونکہ لوگ جانتے ہیں کہ یہ شخص ہمارا خیرخواہ ہے۔ یوں کہنا درست ہے کہ تعلق باللہ داعی کو صرف عابد نہیں بناتا، اسے انسانیت کا درد رکھنے والا مربی اور معالج بھی بناتا ہے، اور یہی کردار دعوت کی اصل طاقت ہے۔

ذکر و عبادت سے قوت اور گناہوں سے حفاظت

چوتھا عملی نتیجہ یہ ہے کہ مضبوط تعلق باللہ داعی کو اندرونی قوت اور پاکیزگی عطا کرتا ہے۔ تہجد کی تاریکی میں رونے والا، قرآن کی تلاوت سے دل کو تازہ رکھنے والا اور ذکر سے زبان کو تر رکھنے والا داعی دن کے میدان میں تھکتا نہیں۔ اس کی روحانی غذا جاری رہتی ہے، اس لیے طویل محنت کے باوجود اس کے اندر وہ اکتاہٹ اور جلن پیدا نہیں ہوتی جو محض ظاہری سرگرمی کرنے والوں کو گھیر لیتی ہے۔ ساتھ ہی یہ تعلق اسے گناہوں سے بھی بچاتا ہے :جو داعی لوگوں کو گناہ چھوڑنے کی تلقین کرتا ہو، اگر خود اسی گناہ میں مبتلا ہو تو اس کی دعوت بے اثر ہو کر رہ جاتی ہے۔ اللہ کا خوف اور اس کی محبت اس کے لیے ڈھال بن جاتے ہیں، خاص طور پر تنہائی کے گناہوں کے مقابلے میں جہاں صرف اللہ ہی دیکھنے والا ہوتا ہے۔

اس حفاظت کا اثر داعی کی سماجی ساکھ پر بھی پڑتا ہے۔ لوگ داعی کی خانگی اور عوامی زندگی کو جانچتے ہیں؛ اگر دونوں میں مطابقت ہو تو اعتماد قائم ہوتا ہے اور بات اثر کرتی ہے۔ تاریخ کی بڑی دعوتی شخصیات کی سوانح پڑھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کی عبادت، زہد اور پرہیزگاری ہی ان کی دعوت کا خاموش مگر سب سے مضبوط ذریعہ تھی۔ یہ بھی یاد رہے کہ تعلق باللہ کا یہ ثمر اچانک ظاہر نہیں ہوتا بلکہ مسلسل مجاہدے سے پیدا ہوتا ہے :وقت کی پابندی، نمازوں کی

حفاظت، گناہ سے توبہ کی تجدید اور نیک صحبت اس کے ذرائع ہیں۔ جو داعی ان ذرائع کو اختیار کرتا ہے، اللہ اس کے کردار میں وہ نور پیدا فرما دیتا ہے جسے دیکھ کر لوگ خود اس کے پیغام کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

خلاصہ

خلاصہ یہ ہے کہ تعلق باللہ کی مضبوطی داعی کے کردار میں ملموس اور عملی نتائج پیدا کرتی ہے :اخلاص اور بے لوثی سے اس کی بات وزنی ہوتی ہے، استقامت، صبر اور توکل سے وہ آزمائشوں میں ثابت قدم رہتا ہے، حسنِ اخلاق اور لوگوں کے درد سے وہ دلوں کے قریب ہو جاتا ہے، اور ذکر و عبادت سے اسے قوتِ عمل اور گناہوں سے حفاظت نصیب ہوتی ہے۔ یہ نتائج کسی ایک خطبے سے حاصل نہیں ہوتے بلکہ اللہ کے ساتھ زندہ تعلق کی مسلسل پرورش سے پیدا ہوتے ہیں۔ اس لیے جو طالب علم یا داعی دعوت میں اثر چاہتا ہے، اسے سب سے پہلے اپنی روحانی بنیاد مضبوط کرنی چاہیے، کیونکہ خشک کنویں سے کوئی سیراب نہیں ہوتا؛ بھرا ہوا دل ہی دوسروں کے دلوں کو سیراب کر سکتا ہے۔

سوال نمبر :3 دعوت کے تین قرآنی اصول اور ان کی جامعیت (20) نمبر

سوال نمبر3 ۔ قرآن کریم نے دعوت کے تین اصول بیان کیے؛ ان اصولوں کی جامعیت سے کیا مراد ہے؟(20)

تعارف

قرآنِ کریم نے دعوت کا صرف حکم ہی نہیں دیا بلکہ اس کا مکمل طریقہ کار بھی بیان فرمایا ہے۔ سورۃ النحل کی آیت نمبر 125 اس موضوع کی جامع ترین آیت ہے، جس میں ارشاد ہوا :اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت کے ساتھ اور اچھی نصیحت کے ساتھ بلاؤ، اور ان سے اس طریقے پر بحث کرو جو سب سے بہتر ہو۔ اس ایک آیت میں دعوت کے تین بنیادی اصول بیان ہوئے ہیں :حکمت، موعظہ حسنہ یعنی اچھی نصیحت، اور مجادلہ بالتی ہی احسن یعنی بہترین انداز میں گفتگو و مناظرہ۔ سوال کا مرکزی نکتہ یہ ہے کہ ان اصولوں کی جامعیت سے کیا مراد ہے، یعنی یہ تین اصول مل کر دعوت کے کن کن پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہیں کہ کوئی اہم ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اس جواب میں پہلے ہر اصول کی الگ وضاحت کی جائے گی، پھر جامعیت کے مختلف پہلوؤں کو منظم انداز میں پیش کیا جائے گا۔

جامعیت کو سمجھنے سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ دعوت ایک انسانی عمل ہے جس میں عقل، دل اور زبان تینوں شامل ہوتے ہیں، اور مخاطب بھی ہر مزاج کا ہوتا ہے۔ اگر دعوت صرف دلیل پر مبنی ہو تو دل خشک رہ سکتا ہے، صرف جذبات پر ہو تو غلط فہمیاں پیدا ہو سکتی ہیں، اور صرف مخالف کے جواب پر ہو تو جھگڑا بن سکتی ہے۔ قرآنی اصولوں کی خوبصورتی یہ ہے کہ انہوں نے ان تینوں انسانی جہتوں اور تینوں قسم کے مخاطبین کو ایک ساتھ سمیٹ لیا ہے۔ اسی لیے مفسرین نے اس آیت کو دعوت کا دستور العمل قرار دیا ہے۔ آگے کی بحث میں یہی دکھایا جائے گا کہ یہ اصول موضوع، اسلوب، مخاطب، زمان و مکان اور مقصد ہر لحاظ سے جامع ہیں۔

تین اصولوں کی وضاحت

پہلا اصول حکمت ہے۔ حکمت کے معنی ہیں :ہر بات کو اس کے مناسب محل پر رکھنا، ہر شخص سے اس کی استعداد کے مطابق کلام کرنا اور ہر موقع پر موزوں ترین ذریعہ اختیار کرنا۔ دعوت میں حکمت کا مطلب یہ ہے کہ داعی پہلے مخاطب کو پہچانے، اس کے سوالات اور الجھنوں کو سمجھے، پھر ٹھوس علم اور پختہ دلیل کے ساتھ بات کرے۔ حکمت میں علم کی درستگی بھی شامل ہے اور بات پیش کرنے کی دانائی بھی۔ دوسرا اصول موعظہ حسنہ ہے، یعنی ایسی نصیحت جو اچھی بھی ہو اور اچھے انداز میں بھی ہو۔ اس میں مخاطب کے دل کو نرم کرنا، اسے آخرت کی یاد دلانا، ترغیب و ترہیب کا متوازن استعمال اور قصوں و مثالوں سے عبرت دلانا شامل ہے۔ وعظ کا تعلق دل اور جذبات سے ہے، جبکہ حکمت کا پہلا رخ عقل اور دلیل سے جڑا ہے۔

تیسرا اصول مجادلہ بالتی ہی احسن ہے۔ جب مخاطب دلیل کے جواب میں دلیل لائے، اعتراض کرے یا بحث کی نوبت آئے تو داعی کو حکم ہے کہ وہ بہترین طریقے پر گفتگو کرے :مخالف کی بات پوری سنے، اس کے مضبوط نکتے کا اعتراف کرے، کمزور نکتے کو نرمی سے واضح کرے، آواز بلند نہ کرے، ذاتیات پر نہ اترے اور جیتنے کے بجائے حق واضح کرنے کو مقصد رکھے۔ یہ اصول اس لیے بھی اہم ہے کہ بحث کا میدان سب سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے؛ یہاں اچھے بھلے داعی بھی غصے اور انا کی وجہ سے دعوت کو نقصان پہنچا دیتے ہیں۔ قرآن نے بحث کو منع نہیں کیا بلکہ اسے بہترین اخلاق کے تابع کر دیا۔ اس بحث کے خلاصے کے طور پر آگے ایک جدول میں تینوں اصولوں کا موازنہ بھی پیش کیا جائے گا تاکہ ہر اصول کا دائرہ اور مناسب مخاطب واضح رہے۔

جدول :دعوت کے تین قرآنی اصول، ان کا دائرہ اور مخاطب

اصول	مفہوم	مناسب مخاطب
حکمت	موقع محل کے مطابق ٹھوس علم اور پختہ دلیل کے ساتھ بات کرنا	حق کے طلبگار اور اہلِ علم
موعظہ حسنہ	دل کو نرم کرنے والی اچھی نصیحت، ترغیب و ترہیب کا توازن	عام لوگ اور نرم دل سامعین
مجادلہ بالتی ہی احسن	بہترین اخلاق کے ساتھ اعتراضات کا جواب اور گفتگو	معاند اور بحث کرنے والے

جامعیت : مخاطبین کی تمام اقسام کا احاطہ

ان اصولوں کی جامعیت کا پہلا پہلو یہ ہے کہ یہ انسانوں کی تمام ذہنی اقسام کو سمیٹ لیتے ہیں۔ انسان تین طرح کے ہوتے ہیں :ایک وہ جو حق کے طلبگار اور دلیل کے قائل ہیں؛ ان کے لیے حکمت اور ٹھوس برہان کافی ہے۔ دوسرے وہ عام لوگ ہیں جو علم تو کم رکھتے ہیں مگر دل نرم رکھتے ہیں؛ ان کے لیے موعظہ حسنہ یعنی پیار بھری نصیحت، قصے اور مثالیں کارگر ہوتی ہیں۔ تیسرے وہ معاند اور بحث کرنے والے ہیں جو آسانی سے ماننے کو تیار نہیں ہوتے؛ ان کے لیے مجادلہ احسن کا اصول مقرر کیا گیا۔ یوں کوئی مخاطب اس دائرے سے باہر نہیں رہا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ اصول ہر دور میں قابلِ عمل رہے ہیں، چاہے مخاطب مکہ کا مشرک ہو، مدینہ کا اہلِ کتاب ہو یا آج کا جدید تعلیم یافتہ نوجوان۔

اس احاطے کی ایک باریک صورت یہ بھی ہے کہ ایک ہی شخص مختلف اوقات میں تینوں حالتوں سے گزر سکتا ہے :کبھی وہ دلیل چاہتا ہے، کبھی دل کی نرمی، اور کبھی اپنے شبہات کا جواب۔ جامع داعی وہی ہے جو موقع محل کے مطابق اصول بدل سکے۔ جو شخص ہر کسی کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکے، مثلاً ہر مجلس کو مناظرے میں بدل دے یا ہر علمی مسئلے کو جذباتی وعظ سے حل کرنا چاہے، وہ ان اصولوں کی جامعیت سے فائدہ نہیں اٹھاتا۔ پس جامعیت کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ داعی کے پاس مکمل اوزار موجود ہوں اور وہ ہر اوزار کو اس کے محل پر استعمال کرنا جانتا ہو۔ قرآن نے تینوں اوزار ایک آیت میں جمع کر کے داعی کو یک رخا ہونے سے بچا لیا ہے۔

جامعیت :عقل، دل اور زبان؛ موضوع اور مقصد کا احاطہ

جامعیت کا دوسرا پہلو انسانی شخصیت کے تینوں مراکز کا احاطہ ہے۔ حکمت عقل کو مطمئن کرتی ہے، موعظہ حسنہ دل کو متحرک کرتی ہے، اور مجادلہ احسن زبان و گفتگو کو اخلاق کے دائرے میں رکھتی ہے۔ جب عقل قائل ہو، دل مائل ہو اور گفتگو شائستہ ہو تو تبدیلی پائیدار ہوتی ہے۔ اس کے برعکس اگر صرف عقل قائل ہو مگر دل سخت رہے تو آدمی حق جانتے ہوئے بھی عمل نہیں کرتا، اور اگر صرف جذبات ابھریں مگر علم نہ ہو تو جوش ٹھنڈا ہوتے ہی انسان پرانی حالت پر لوٹ جاتا ہے۔ تینوں اصول مل کر علم، ایمان اور عمل کی مکمل زنجیر بناتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس آیت کو دعوت کی جامعیت کی دلیل کہا جاتا ہے، کیونکہ اس میں دعوت کا کوئی انسانی پہلو چھوڑا نہیں گیا۔

تیسرا پہلو موضوع اور مقصد کی جامعیت ہے۔ آیت میں دعوت کا موضوع سبیل رب یعنی رب کا راستہ مقرر کیا گیا ہے، جس میں عقیدہ، عبادت، اخلاق اور معاملات سب شامل ہیں، اور مقصد محض نظریاتی بات منوانا نہیں بلکہ بندے کو رب سے جوڑنا ہے۔ آیت کے اگلے حصے میں یہ بھی واضح کر دیا گیا کہ ہدایت دینا اللہ کے اختیار میں ہے، داعی کا کام اصولوں کے ساتھ کوشش کرنا ہے۔ اس سے داعی مایوسی اور زبردستی دونوں سے بچ جاتا ہے۔ یوں یہ آیت دعوت کا مقصد، موضوع، طریقہ، مخاطب اور انجام، سب کی راہنمائی ایک ساتھ فراہم کرتی ہے۔ یہی اجتماعِ کمالات جامعیت کہلاتا ہے :مختصر الفاظ میں مکمل نظام۔ آج جب دعوت کے نام پر کہیں شدت، کہیں محض رسمی وعظ اور کہیں بے مہابا بحث نظر آتی ہے تو اس کی وجہ انہی اصولوں میں سے کسی ایک کو چھوڑ دینا ہے۔

خلاصہ

خلاصہ یہ ہے کہ سورۃ النحل کی آیت میں بیان کردہ تین اصول :حکمت، موعظہ حسنہ اور مجادلہ بالتی ہی احسن، دعوت کا مکمل نظام ہیں۔ ان کی جامعیت سے مراد یہ ہے کہ یہ تمام اقسام کے مخاطبین، انسانی شخصیت کے تمام مراکز یعنی عقل، دل اور زبان، اور دعوت کے تمام مراحل یعنی ابلاغ، ترغیب اور دفاع کا احاطہ کرتے ہیں۔ ان میں سے کسی ایک اصول کو چھوڑ دینے سے دعوت یک رخا اور ناقص ہو جاتی ہے۔ ایک کامیاب داعی وہی ہے جو عالم کے سامنے حکمت کی دلیل، عام آدمی کے سامنے نصیحت کی نرمی اور مخالف کے سامنے بحث کی شائستگی کو بیک وقت برقرار رکھے۔ یہی جامعیت اسلام کی دعوت کو ہر زمانے اور ہر معاشرے کے لیے قابلِ عمل بناتی ہے۔

سوال نمبر :4 انسانوں کا ایک امت ہونا اور اختلاف کا پیدا ہونا :قرآنی مفہوم 20) نمبر(

سوال نمبر4 ۔ قرآن کی روشنی میں انسانوں کے ایک امت ہونے اور بعد میں اختلاف پیدا ہونے کا کیا مفہوم ہے؟(20)

تعارف

قرآنِ کریم نے انسانی تاریخ کا ایک بنیادی قانون بیان فرمایا ہے کہ ابتدا میں تمام انسان ایک ہی امت تھے، پھر ان میں اختلاف پیدا ہوا تو اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کو خوشخبری دینے والے اور ڈرانے والے بنا کر بھیجا تاکہ وہ لوگوں کے درمیان ان کے اختلافات کا فیصلہ کریں۔ یہ مضمون سورۃ البقرہ آیت 213 اور سورۃ یونس آیت 19 سمیت کئی مقامات پر آیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ایک امت ہونے کا مفہوم کیا ہے اور اختلاف سے مراد کون سا اختلاف ہے؟ اس سوال کا درست جواب دعوت کے فلسفے کو سمجھنے کے لیے بہت ضروری ہے، کیونکہ اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء کی بعثت اور دعوت و ارشاد کا سلسلہ خود انسانی تاریخ کی ایک بنیادی ضرورت ہے۔ اس جواب میں پہلے ایک امت کے مفاہیم، پھر اختلاف کی نوعیت اور اس کے اسباب، اور آخر میں اس قرآنی بیان کے دعوتی نتائج بیان کیے جائیں گے۔

اس موضوع پر غور کرتے ہوئے یہ بات ذہن میں رہے کہ امت کا لفظ قرآن میں کسی ایک جماعت، ایک طریقے اور ایک دین پر متفق لوگوں کے لیے آتا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہونے والی انسانیت فطرتِ توحید پر قائم تھی۔ جیسے جیسے نسل بڑھی، دوریاں پیدا ہوئیں، شیطان نے شرک اور نفسانی خواہشات نے بدعات و اختلافات کو جنم دیا۔ مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں دو مشہور آراء بیان کی ہیں :ایک یہ کہ تمام انسان ابتدا میں حق اور توحید پر متفق تھے، پھر اختلاف پیدا ہوا؛ دوسری یہ کہ مراد یہ ہے کہ انسان فطری طور پر ایک ہی نوع اور ایک ہی اصل سے ہیں۔ اگلے عنوانات میں ان آراء کو جمع کر کے اصل مفہوم واضح کیا جائے گا تاکہ طالب علم امتحانی سوال کا مدلل جواب لکھ سکے۔

ایک امت ہونے کا مفہوم

ایک امت ہونے کا پہلا مفہوم وحدتِ دین و عقیدہ ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام اور ان کی قریبی اولاد اللہ کی توحید، اس کی عبادت اور اس کے احکام کی اطاعت پر متفق تھی۔ نہ بت پرستی تھی، نہ فرقہ بندی، نہ مذہبی خانہ جنگی۔ انسان ایک خدا کو مانتا، ایک ہی شریعت کی پیروی کرتا اور ایک ہی اخلاقی نظام کا پابند تھا؛ اسی اشتراک کا نام امتِ واحدہ ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول تفسیر کے مطابق آدم اور نوح علیہما السلام کے درمیانی عرصے میں لوگ اللہ کی اطاعت پر قائم رہے، پھر اختلاف رونما ہوا۔ اس مفہوم سے دعوت کی اصل تصویر سامنے آتی ہے کہ داعی انسانوں کو کسی نئی چیز کی طرف نہیں بلاتا بلکہ ان کی اصل فطری وحدت کی طرف واپس لوٹاتا ہے۔

دوسرا مفہوم وحدتِ اصل و فطرت ہے۔ تمام انسان ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہیں، ان کی بنیادی ضروریات، جذبات اور فطری میلانات ایک جیسے ہیں، اور فطرتِ سلیمہ ہر انسان کو ایک خدا کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ اس لحاظ سے بھی بنی نوع انسان ایک امت ہے :ایک اصل، ایک فطرت اور ایک مقصدِ تخلیق، یعنی اللہ کی بندگی۔ اس مفہوم کی روشنی میں رنگ، نسل، زبان اور خطے کے فرق ثانوی ہیں اور انسانیت کا بنیادی رشتہ فوقیت رکھتا ہے۔ قرآن نے دوسری جگہ بھی فرمایا کہ ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور قبیلوں میں اس لیے تقسیم کیا تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ یوں ایک امت ہونا انسان کی پیدائشی حقیقت ہے، جبکہ تقسیم اور تفرقہ بعد میں پیدا ہونے والی صورتیں ہیں جن کا علاج دعوت کے ذریعے کیا جاتا ہے۔

اختلاف پیدا ہونے کا مفہوم اور اس کے اسباب

اختلاف سے مراد ہر قسم کی رائے کی گوناگونی نہیں ہے، کیونکہ اجتہادی اور فروعی اختلاف بعض صورتوں میں رحمت بھی ہو سکتا ہے۔ یہاں اختلاف سے مراد دین کے بنیادی اصولوں، خاص طور پر توحید، میں انحراف اور حق سے بغاوت پر مبنی تفرقہ ہے۔ قرآن نے سورۃ آل عمران میں واضح فرمایا کہ جن لوگوں نے اختلاف کیا انہوں نے واضح دلائل آ جانے کے بعد، آپس کی ضد اور حسد کی وجہ سے کیا۔ اس سے اختلاف کے بڑے اسباب سامنے آتے ہیں :پہلا سبب علم کے بعد ضد اور باہمی بغض ہے، دوسرا سبب دنیوی مفادات اور قیادت کی خواہش، تیسرا سبب نفسانی خواہشات کی پیروی، اور

چوتھا سبب شیطان کا ورغلانا جو انسان کو فطرتِ توحید سے ہٹا کر شرک اور بت پرستی کی طرف لے جاتا ہے۔ سیرت و تاریخ کی روایات میں قومِ نوح کی مثال اسی کی ہے کہ نیک لوگوں کی تصویروں اور مجسموں سے شرک کا آغاز ہوا۔

اس اختلاف کا نتیجہ یہ نکلا کہ انسانیت گروہوں میں بٹ گئی، حق و باطل کی پہچان مشکل ہونے لگی اور کمزوروں پر ظلم ہونے لگا۔ تب اللہ تعالیٰ کی رحمت نے تقاضا کیا کہ انبیاء کا سلسلہ شروع ہو۔ آیتِ مذکورہ میں بعثتِ انبیاء کے دو کام بیان ہوئے :بشارت و نذارت یعنی نیکوکاروں کو خوشخبری اور نافرمانوں کو تنبیہ، اور کتاب کے ذریعے اختلافات کا فیصلہ۔ اس سے ایک اہم اصول ملتا ہے کہ اختلاف کا فیصلہ خواہش یا طاقت سے نہیں ہوتا بلکہ وحی کی روشنی میں ہوتا ہے۔ آج کے دور میں بھی جو اختلافات فرقہ واریت اور شدت پسندی کی صورت اختیار کر لیتے ہیں، ان کی جڑ یہی ہے کہ فیصلے کا مرجع کتاب و سنت کے بجائے انا، روایت پرستی اور گروہی عصبیت کو بنا لیا جاتا ہے۔ قرآن کا بیان کردہ مفہوم ہمیں اسی اصل مرجع کی طرف لوٹاتا ہے۔

اس قرآنی بیان کے دعوتی نتائج

اس مفہوم سے دعوت کے لیے کئی اہم نتائج نکلتے ہیں۔ پہلا نتیجہ یہ ہے کہ دعوت کا کام انسانیت کو اس کی اصل وحدت کی طرف بلانا ہے؛ داعی تفرقہ پیدا کرنے والا نہیں بلکہ جوڑنے والا ہوتا ہے۔ دوسرا نتیجہ یہ ہے کہ اختلاف کو فطری اور ہمیشہ باقی رہنے والی چیز سمجھ کر مایوس نہیں ہونا چاہیے، بلکہ اس کا علاج انبیاء کے طریقے یعنی کتاب کی روشنی میں فیصلے اور بشارت و نذارت کے توازن سے کرنا چاہیے۔ تیسرا نتیجہ یہ ہے کہ داعی کو اختلاف کی اصل جڑوں، یعنی ضد، حسد اور مفاد پرستی، کو پہچاننا چاہیے، کیونکہ جب تک یہ اخلاقی بیماریاں دور نہ ہوں، محض علمی دلائل سے اختلاف ختم نہیں ہوتا۔ چوتھا نتیجہ یہ ہے کہ وحدت کا مطلب زبردستی یکسانیت نہیں؛ وحدت اصولوں پر اتفاق کا نام ہے، اور فروعی تنوع اس کے منافی نہیں۔

پانچواں نتیجہ امتِ مسلمہ کی ذمہ داری سے متعلق ہے۔ جس طرح انبیاء اختلافات میں فیصلہ کرنے کے لیے آئے، اسی طرح ان کی امت پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنے دور کے فکری اور اخلاقی اختلافات میں وحی کی روشنی پیش کرے۔ اسی لیے قرآن نے اس امت کو امتِ وسط یعنی متوازن اور گواہ امت قرار دیا۔ اگر مسلمان خود اختلافات کا شکار ہو کر فیصلہ کن کردار ادا کرنا چھوڑ دیں تو یہ ان کے دعوتی منصب سے غفلت ہوگی۔ پس یہ آیت صرف تاریخی اطلاع نہیں

دیتی بلکہ ہر دور کے داعی کو اس کا منصب اور طریقہ کار بھی بتا دیتی ہے۔ طالب علم کے لیے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ وحدت انسان کی اصل ہے، اختلاف عارضی بیماری، وحی اس کا علاج، اور دعوت اس علاج کو انسانیت تک پہنچانے کا نام ہے۔

خلاصہ

خلاصہ یہ ہے کہ قرآن کی رو سے انسانوں کا ایک امت ہونا اس بات کا بیان ہے کہ وہ ابتدا میں توحید و اطاعت کے ایک دین پر متفق تھے اور اصل و فطرت کے اعتبار سے آج بھی ایک ہی انسانی خاندان ہیں۔ اختلاف سے مراد حق آ جانے کے بعد ضد، حسد، مفاد اور شیطانی وسوسوں کی وجہ سے پیدا ہونے والا وہ تفرقہ ہے جس نے شرک اور گروہ بندی کو جنم دیا۔ اسی اختلاف کے علاج کے لیے اللہ نے انبیاء بھیجے اور کتابیں نازل فرمائیں۔ دعوت اسی نبوی مشن کی توسیع ہے جس کا مقصد انسانیت کو دوبارہ اس کی فطری وحدت، یعنی توحید، عدل اور اخوت کی طرف لوٹانا ہے۔ یہی مفہوم اس سوال کا مرکزی جواب ہے۔

سوال نمبر :5 غارِ حرا کی خلوت گزاری اور دعوتِ نبوی کے آغاز کا باہمی ربط (20 نمبر)

سوال نمبر5 ۔ غارِ حرا میں خلوت گزاری کا دورانیہ دعوتِ نبوی کے آغاز سے کس طرح مربوط ہے؟(20)

تعارف

دعوتِ نبوی کا آغاز کسی اچانک اعلان سے نہیں ہوا بلکہ اس سے پہلے ایک طویل روحانی تیاری کا مرحلہ تھا جس کا مرکز غارِ حرا کی خلوت گزاری ہے۔ نبی کریم ﷺ نبوت سے قبل جبلِ نور کی اس غار میں تشریف لے جا کر کئی کئی راتیں تنہائی میں عبادت و تفکر میں گزارتے تھے، یہاں تک کہ اسی غار میں پہلی وحی نازل ہوئی اور اقرأ کے حکم سے دعوت کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ سوال اس خلوت کے دورانیے اور دعوت کے آغاز کے باہمی ربط کے بارے میں ہے، یعنی یہ تنہائی کا عرصہ محض ایک سیرتی واقعہ تھا یا دعوت کی کامیابی کے نظام کا لازمی حصہ؟ اس جواب میں پہلے خلوتِ حرا کے دورانیے سے متعلق

روایات کا خلاصہ، پھر اس عرصے کی نوعیت، اور آخر میں اس کے دعوت کے آغاز سے ربط کے مختلف پہلو بیان کیے جائیں گے۔

سیرت کی مستند ترین روایت صحیح بخاری میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے جس میں وحی کے آغاز کا بیان ہے کہ پہلے سچے خواب آئے، پھر آپ ﷺ کو خلوت محبوب کر دی گئی، چنانچہ آپ غارِ حرا میں جا کر کئی راتیں عبادت کرتے، پھر حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پاس لوٹ کر مزید زادِ راہ لے جاتے، یہاں تک کہ آپ کے پاس حق یعنی وحی آ گئی۔ اس روایت سے دو باتیں واضح ہوتی ہیں: خلوت کا عمل نزولِ وحی سے پہلے کا ہے اور اس کا دورانیہ ایک دن یا ایک ملاقات نہیں بلکہ بار بار اور مسلسل لوٹنے والا ایک طویل معمول تھا۔ اسی تسلسل کو سمجھنا اس سوال کی کنجی ہے۔

خلوتِ حرا کا دورانیہ: روایات کا خلاصہ

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کی خلوت گزاری کا معمول نبوت سے کئی سال پہلے شروع ہو چکا تھا۔ اہلِ سیرت نے بیان کیا ہے کہ آپ ﷺ ہر سال ماہِ رمضان غارِ حرا میں گزارتے تھے، جس طرح قریش کے بعض صاحبِ فطرت لوگ بھی اپنے اپنے انداز میں اس مہینے میں اعتکاف و خلوت کیا کرتے تھے۔ ابن ہشام وغیرہ نے اسے تحنث سے تعبیر کیا ہے، یعنی بت پرستی اور گناہوں سے بیزاری کے ساتھ عبادت میں مشغول ہونا۔ بعض روایات میں اس عرصے کو نبوت سے قبل کے آخری برسوں کا باقاعدہ معمول بتایا گیا ہے، جب آپ ﷺ کی عمر مبارک چالیس سال کے قریب تھی اور وحی کی علامات، یعنی سچے خواب، شروع ہو چکی تھیں۔ چھ ماہ تک آنے والے یہ خواب بھی اسی تیاری کے دور کا حصہ سمجھے جاتے ہیں۔

یہاں ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ دورانیے کی اصل اہمیت تعدادِ سال میں نہیں بلکہ اس کے بتدریج اور مسلسل ہونے میں ہے۔ کبھی آپ چند راتیں قیام فرماتے، کبھی زادِ راہ ختم ہونے پر واپس تشریف لا کر دوبارہ چلے جاتے۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی طرف سے زادِ راہ کی فراہمی اور اس عمل کی خاموش تائید بھی اس دور کا حصہ ہے، جس سے پتا چلتا ہے کہ یہ تیاری انفرادی ہونے کے باوجود اہلِ خانہ کی معرفت و تعاون کے ساتھ ہو رہی تھی۔ علمائے سیرت نے اس تسلسل کو اس بات کی دلیل قرار دیا ہے کہ وحی جیسی عظیم ذمہ داری کے لیے قلبِ نبوی کو اللہ تعالیٰ نے پہلے سے خاص تربیت سے تیار

فرمایا۔ یوں دورانیہ خود ایک پیغام ہے :بڑی ذمہ داری اچانک نہیں دی جاتی، اس کے لیے ایک تیاری کا زمانہ مقرر ہوتا ہے۔

خلوت کا دورانیہ بطور تیاری :دعوت کے آغاز سے پہلا ربط

خلوتِ حرا کے دورانیے کا دعوت کے آغاز سے پہلا ربط تیاری اور استعداد کا ہے۔ دعوتِ نبوی کوئی معمولی کام نہ تھا؛ اس میں جاہلیت کے صدیوں پرانے نظام سے ٹکراؤ، قریش کی مخالفت اور پوری انسانیت کی رہنمائی کا بوجھ شامل تھا۔ ایسا بوجھ وہی دل اٹھا سکتا ہے جو پہلے اللہ کے ساتھ گہرے تعلق میں پختہ ہو چکا ہو۔ خلوت کے طویل عرصے میں آپ ﷺ کا دل دنیوی شور و شر سے کٹ کر خالقِ کائنات کی قدرتوں میں غور و فکر کا عادی ہوا۔ اسی لیے پہلی وحی کے بعد جب آپ ﷺ گھبراہٹ کے ساتھ حضرت خدیجہ کے پاس تشریف لائے تو آپ کے الفاظ میں اسی تیاری کا ثمر نظر آتا ہے اور حضرت خدیجہ نے آپ کے اخلاق و کردار کی گواہی دے کر تسلی دی۔ یہ کردار ظہور سے پہلے کے انہی برسوں میں نکھرا تھا۔

دوسرا ربط یہ ہے کہ خلوت کے دورانیے نے دعوت کے پہلے مرحلے کی خفیہ اور تدریجی نوعیت کی بنیاد رکھی۔ جو شخص برسوں تنہائی میں اپنے رب سے راز و نیاز کر چکا ہو، وہی دعوت کو شور و شغب کے بجائے سکون، حکمت اور تدریج سے شروع کر سکتا ہے۔ چنانچہ دیکھا جاتا ہے کہ دعوت کا مکی آغاز بھی تدریجی تھا :پہلے قریبی افراد، پھر خفیہ دعوت، پھر علانیہ دعوت۔ یہ تدریج اتفاقیہ نہیں تھی بلکہ اس مزاج کا اظہار تھی جو حرا کی خلوت میں تشکیل پایا تھا۔ یہاں آج کے داعی کے لیے بڑا سبق ہے کہ عوامی میدان میں آنے سے پہلے تنہائی میں اللہ سے تعلق بنانا ضروری ہے؛ جو شخص تیاری کے دورانیے کو مختصر کر کے فوراً شہرت و قیادت کا خواہش مند ہو جائے، اس کی دعوت میں وہ گہرائی اور استقامت پیدا نہیں ہوتی جو نبوی طریقے کی پہچان ہے۔

وحی کا نزول اسی غار میں :مکانی و زمانی ربط

تیسرا اور سب سے ظاہر ربط یہ ہے کہ دعوت کا آغاز لفظی اور مکانی طور پر اسی خلوت گاہ سے ہوا۔ فرشتہ اسی غار میں آیا، پہلی پانچ آیات اسی جگہ نازل ہوئیں اور اقرأ باسم ربک کا حکم اسی تنہائی میں ملا۔ گویا خلوت کا آخری لمحہ دعوت کا پہلا لمحہ بن گیا۔ اس میں حکمت یہ معلوم ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دکھا دیا کہ دعوت کی ابتدا بندوں کی

بھیڑ سے نہیں، رب کے حضور حاضری سے ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سورۃ المزمل اور سورۃ المدثر میں بھی دعوت کے حکم کے ساتھ قیام اللیل اور ذکر کا حکم ساتھ دیا گیا، تاکہ خلوت و جلوت کا یہ ربط ہمیشہ قائم رہے :رات کو اللہ سے قوت لینا اور دن کو بندوں تک پیغام پہنچانا۔

چوتھا ربط فترتِ وحی کے عرصے سے سمجھ آتا ہے۔ پہلی وحی کے بعد کچھ عرصہ وحی کا سلسلہ رکا رہا، جس میں آپﷺ کی کیفیت اشتیاق اور انتظار کی تھی۔ اس وقفے کو بھی علما نے اسی تیاری کے نظام کا حصہ قرار دیا ہے کہ دل وحی کے بوجھ کے لیے مزید تیار ہو جائے اور شوق بڑھ جائے۔ پھر سورۃ المدثر کی آیات قم فانذر کے ساتھ دعوت کا علانیہ آغاز ہوا۔ غور کیا جائے تو سارا سلسلہ ایک ہی تسلسل ہے :برسوں کی خلوت، چھ ماہ کے سچے خواب، پہلی وحی، وقفہ، پھر باقاعدہ انذار کا حکم۔ دورانیے کی یہ طوالت بتاتی ہے کہ دعوت کا آغاز کسی جلد بازی کا نتیجہ نہیں، بلکہ اللہ کی مقرر کردہ تدریجی تربیت کا پختہ پھل تھا۔ اس ربط کو سمجھ لینے کے بعد سیرت کے یہ واقعات الگ الگ خبریں نہیں رہتے بلکہ ایک مکمل نظامِ تیاری کی کڑیاں بن جاتے ہیں۔

خلاصہ

خلاصہ یہ ہے کہ غارِ حرا کی خلوت گزاری کا دورانیہ دعوتِ نبوی کے آغاز سے گہرے اور کثیر جہتی ربط رکھتا ہے۔ روایات کے مطابق یہ خلوت نبوت سے کئی برس پہلے کا مسلسل معمول تھی، خاص طور پر ماہِ رمضان میں، اور اس کا آخری مرحلہ سچے خوابوں اور پھر پہلی وحی پر منتج ہوا۔ ربط کے پہلو یہ ہیں :یہ عرصہ وحی کے عظیم بوجھ کے لیے قلبی و روحانی تیاری تھا، اسی نے دعوت کے تدریجی اور پرحکمت مزاج کی بنیاد رکھی، اسی غار سے دعوت کا مکانی آغاز ہوا، اور فترتِ وحی سمیت پورا تسلسل اللہ کی تدریجی تربیت کو ظاہر کرتا ہے۔ داعی کے لیے اس کا ابدی سبق یہ ہے کہ میدانِ دعوت میں اترنے سے پہلے خلوت میں اللہ سے تعلق کا ایک سنجیدہ دورانیہ ضروری ہے۔